پسِ آئینہ

سائرہ رضا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سائرہ رضا

یہ بس آئینہ

"جوڑوں کا درد، گھٹنوں، پٹھوں کا درد تو اتنا پرانا ہو گیا تھا کہ اب تو ہائے ہائے کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا، مگر یہ جو نئی تکلیف ایڑیوں میں اٹھی تھی۔ اس نے مانو جان عذاب کر دی تھی۔ ہر قدم پر آہ نکل جاتی، لگتا کیل گڑے ہیں۔ اب بھی نماز کے وقت کی تنگی کا خیال نہ ہوتا تو کبھی اٹھ کر نہ آتیں۔ سارے گھر میں اٹیچ باتھ رومز تھے۔ بس وہی پیچھے بنی لانڈری والا واش روم استعمال کرتی تھیں۔ سو اس درد کی وجہ سے اب وہاں تک آنا جانا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف

ناولٹ



لگنے لگا تھا۔

جون کی دھوپ ڈھل چکی تھی۔ وضو کر کے گدلے ساؤں کو دیکھتے ہوئے نماز کی ادائی کے لیے تخت پر ہی بیٹھ گئیں۔ صبح کی نماز اپنے کمرے میں اور رات کی نماز یہاں پڑھنے میں انہیں سکون ملتا تھا۔ جب سے ثمر نے سبز جالی کا شیڈ تان دیا تھا تب سے ایک نرم سی ٹھنڈک محسوس ہونے لگی تھی۔

نماز پڑھنے کے دوران ہی انہیں گھر میں چہل پہل کا احساس ہونے لگا تھا۔ دوپہر کی ڈیڑھ دو گھنٹے کی نیند پوری کر کے سب اٹھتے تو تازہ دم ہوتے۔ اور اب شام کی چائے کی تیاری ہو رہی تھی۔

وہی روز کا معمول.... وہ ہر بار اپنا دھیان نماز میں لگانا چاہتیں، مگر آوازوں سے دھیان بٹنے لگتا۔

"گڑیا پیپر لاؤ.... ارے گڑیا بیٹا!.... ایک آواز میں سن لیا کرو۔"

یہ ثمر کی بیوی کی آواز تھی۔ اسے کام کرنے کے دوران بولنے کی عادت تھی۔ سارے گھر کو خبر رہتی وہ کس وقت کہاں ہے کیا کر رہی ہے۔

کپڑے دھوتی تو وہ نمبر سرف سے لے کر بلیچ تک کے نقصانات پر لیکچر دیتی۔ استری کرتی تو کوئلے کی استری.... اسپرے والی استری اور سادہ استری کا فرق بتانے لگتی۔

سبزی بناتی تو اس کی غذائیت پر لیکچر دیتی یا پھر گٹر کے پانی والی سبزیوں کی پہچان اور نقصان پر بولنے لگتی۔

بچوں کو اسکول جانے کے لیے تیار کرتی، تو ناشتے



کے فوائد پر اس وقت تک بولتی جب تک گھر کا آخری بندہ بھی کھا پی کر فارغ نہ ہو جاتا۔
اسکول سے واپس آنے پر لنچ بکس جوں کا توں دیکھتی تو تقریر شروع۔ لنچ بکس خالی ہوتا تب بھی شامت۔
"آج کیسے کھالیا۔۔۔؟ خود ہی کھایا یا کسی دوست کو کھلا دیا یا کہیں پھینک پھانک آئے۔" غرض ثمر کی بیوی کا کام بولنا تھا۔
وہ تشہد میں بیٹھی تھیں۔ اللہ جانے کیا پڑھا۔ سارا دھیان تو اس لیکچر کی طرف چلا گیا تھا جو ثمر کی بیوی نے بیٹی کو دینا تھا۔
زیادہ دیر تک پمپر لگا رہے تو جلد پر کیسے کیسے نقصانات ہوتے ہیں۔ ریشز الرجی۔ بیماریاں۔۔۔ (بے چاری کو پمپر لانے میں دیر ہو گئی ہو گی۔۔۔)
آنکھ کھلتے ہی ٹی وی جو لگا لیا جاتا تھا۔ اس پر بھی جھگڑا۔ یہ چینل اور وہ چینل۔۔۔
سلام پھیر کے ہاتھ دعا کو اٹھائے، تب ہی منجھلی بہو کی للکار نے سب بھلا دیا۔ کیا مانگنا تھا۔ معافی، بخشش، مغفرت یا پھر دنیا کی وہ ضرورتیں جو مغفرت سے بھی زیادہ ضروری لگتی تھیں۔ وہ دعائیں جو چلتے پھرتے نوک زبان پر رہتی تھیں۔
"اللہ! اظہر کو صاحب اولاد کر۔۔۔ اللہ ثمر کی ترقی کر۔۔۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، مہنگائی کا زمانہ۔ مہنگی تعلیم ہے۔"
(پھر تھک ہار کر) "اللہ تو سب کو ہدایت دے۔ ثمر کے آفس والوں کو تنخواہ نہیں بڑھاتے۔"
بڑی بیٹیوں کے لیے دعا کرتیں جو اپنے بچوں کے رشتے کے لیے پریشان تھیں۔
اور آخر میں اپنے دونوں چھوٹے بچوں کے لیے۔۔۔ جو اتنے چھوٹے بھی نہیں تھے، مگر چھوٹا ہونا ان کی ایسی نشانی تھی جو بڈھے ہونے پر بھی ساتھ رہتی تھی۔
مگر یہ منجھلی بہو۔۔۔ اس کی دھاڑیں۔۔۔ اف۔
کہاں تھا سکون۔ کہیں بھی نہیں۔۔۔ کہنے کو وہ سارے گھر سے کٹ کر نماز ادا کرنے آئی تھیں۔
"ہزار بار کہا ہے سارا دن ٹی وی دیکھو مگر نیوز ہیڈ لائنز کے وقت ریموٹ روک دو۔ شہر کے حالات پتا ہیں نا بلکہ پورے ملک کے۔۔۔"
"آئے دن کے ہنگامے، دھماکے، فساد۔۔۔ بندہ بے خبری میں تو نہ مارا جائے۔"
منجھلی کو باخبر رہنے کا شوق تھا۔ بڑے مدبرانہ انداز سے خبریں اور تبصرے سنتی تھی۔
"کیا فائدہ باخبر رہنے سے۔۔۔ جو فساد ہونا ہوتا ہے، وہ تو ہو چکا ہوتا ہے۔ ہم گھر بیٹھ کر کیا کرلیں گے۔" یہ آواز منجھلی ہی کے بڑے بیٹے کی تھی۔
"اوں ہوں خاموش۔۔۔" نیوز شروع ہوا چاہتی تھیں لہٰذا منجھلی نے تین حرف کہے۔ ورنہ وہ بیٹے کی طبیعت بھی صاف کر سکتی تھی۔ (بعد میں ضرور کرتی)
"سب سے پہلے ہیڈ لائنز۔۔۔"
انہوں نے منہ پر ہاتھ پھیرلیا۔ منجھلی کو خبریں سننے کا ہی نہیں سنوانے کا بھی شوق تھا۔ لہٰذا آواز بڑھا چکی تھی۔
"امریکی صدارتی انتخابات۔۔۔" "ہمنہ کالا جائے یا گورا آئے، کیا فرق پڑتا ہے۔" انہوں نے سر جھٹکا۔
"کراچی میں امن وامان۔۔۔ ہاں اللہ کرے۔" ان کا دل بولا۔
پانامہ لیکس پر۔۔۔ اوہ۔۔۔ ان کا سر بے ساختہ اوپر اٹھا۔۔۔ کان کھل گئے۔ اللہ جانے نیوز اینکر کیا کیا تفصیلات دیتی جارہی تھی۔
انہیں بڑی مشکل سے بھولی کہانی پھر سے یاد آگئی۔ کتنی دقتوں سے دھیان ہٹایا تھا۔ خود کو سمجھانے کا مرحلہ تو ابھی باقی تھا کہ پوری بات سمجھ میں ہی نہ آئی تھی بلکہ سمجھنے سے پہلے یقین کی منزل۔۔۔ پُرپیچ راستہ، ڈگمگاتے قدم۔۔۔ اور آنکھوں کے آگے آتا جالا۔۔۔
نیوز اینکر نجانے کہاں کہاں سے خبر جوڑ رہا تھا۔۔۔ وہی پانامہ لیکس۔
اور یہ بین الاقوامی خبر تھی۔۔۔ جس نے قوم کے اندر بھونچال پیدا کر دیا تھا۔ پانامہ لیکس اور وہ جو شاہانہ نے سنائی تھی۔
اور جسے ثمین نے شاہانہ لیکس کا نام دیا تھا۔

اور بعد میں خود ہی اپنے بیان کی نفی کرتے ہوئے نام بدل کر "ثمامہ لیکس" رکھ کر وہ کتنی دیر تک ہنستی رہی تھی۔

اور جہنم میں جائے' شاہانہ۔۔۔ پانامہ یا پھر ثمامہ لیک۔ بات تو یہ تھی کہ ان کے دل پر بڑا قہر ڈھایا تھا۔

اور ثمین ہنس ہنس کر بے حال تھی۔

اور ثمامہ اس نے کھول کھول کر سارا قصہ سنایا۔ نجانے کہاں سے بھیدی ڈھونڈ لایا تھا۔ جس نے لنکا ڈھانے کی قسم کھالی تھی۔ اور بعد میں یوں ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔۔ لاپروا تھا وہ فطرتاً"۔۔۔ اپنے آپ میں گم رہتا یا پھر ثمین کے پلو سے بندھ جاتا۔۔۔ دونوں کے شوق 'پسند ناپسند سب ایک سی تھیں۔ جب دونوں ساتھ ہوتے تو پھر کوئی اور ہو نہ ہو قطعاً "فرق نہ پڑتا۔

شاید انہیں اندازہ بھی نہیں تھا کہ ماں کتنی حیران اور دل برداشتہ تھی یا پھر یہ جوانی مستانی ہے۔ جس پر سرد و گرم کا بھی اثر نہیں پڑتا اور ادھر وہ بڑھاپے کی دہلیز پار کر چکی تھیں۔

ساٹھ سال کی عمر کم نہیں ہوتی۔ اس پر بیوگی 'اس پر فکریں۔۔۔ غم دوراں۔۔۔ ہر فکر پہلے سے بڑھ کر۔۔۔ ہر غم پچھلے سے بھاری۔

انفرادی غم۔۔۔ اجتماعی غم۔۔۔ ساری قوم اور قوم کے نام نہاد رہنما 'پانامہ لیکس کی ریتی پر اپنے اپنے چھرے تیز کرنے کو تیار کھڑے تھے۔ ایسا موقع پھر کہاں۔۔۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے' گریبان پکڑنے کا نیا موقع۔۔۔

وہ خود سے نادم تھیں مگر انہیں اجتماعی غم سے بڑھ کر انفرادی صدمے نے توڑا تھا۔ وہی انفرادی دھچکا۔ شاہانہ لیکس یا پتا نہیں ثمامہ لیکس۔۔۔

وہ سر سے دوپٹا اتار کر چھوٹی سی جوڑی کو کسنے لگیں۔ تب ہی ثمر کی بیوی مسکراتے چہرے کے ساتھ چائے کا کپ چھوٹی سی ٹرے میں سلیقے سے رکھ کر لے آئی۔

"وہ پنکھا چلا لیتیں آپ امی۔۔۔!" اس نے کہنے کے ساتھ پیڈسٹل فین گھسیٹ کر عین ان کے سامنے کر دیا۔

"خواب ہوئے وہ زمانے جب سہ پہر کی چائے ٹھنڈی ہوا میں پی جاتی تھی۔ اب تو گرمی کا یہ عالم ہے کہ شام سات بجے بھی کڑاکے کی دوپہر یاد آجاتی ہے۔ ویسے یہ گرین جالی لگوانے سے بڑا سکون ہو گیا ہے۔"

"خبروں میں بتا رہے تھے۔ گرمی ابھی اور بڑھے گی۔ چند روز میں روزے آجائیں گے۔ اہل ایمان ہی رکھیں گے روزے۔۔۔"

"اور اللہ رحم رکھے گا تو کھولیں گے کیسے۔۔۔ آپ نے سنا' چنے کی دال ایک سو ساٹھ روپے کلو ہو گئی ہے۔ بیسن کا حال دیکھیے گا آپ۔"

ثمر کی بیوی بولتی بھی جا رہی تھی' ساتھ ساتھ اس نے تار سے ڈھلے کپڑے بھی اتار لیے تھے۔

"اور ہاں! آپ نے سبزی کا تو بتایا ہی نہیں۔ آج کیا پکے گا؟"

"یہ بھی نری مصیبت۔۔۔ ہر بندے کی پسند الگ۔ کتنی ہانڈیاں چڑھائی جائیں آخر۔"

"آپ کچھ بول نہیں رہیں امی!" اسے دھیان آیا۔

"کیا بولوں؟" وہ اتنا ہی کہہ سکیں۔

"کڑھی بنا لیتی ہوں۔ پکوڑے کے لالچ میں کھا لیں گے بچے' پھر رمضان میں تو کڑھی بنے گی نہیں' ٹھیک ہے نا۔۔۔؟ اور یہ منجھلی ٹی وی کتنا اونچا لگا لیتی ہے۔ وہی گھسی پٹی خبریں۔ میرے تو کان پک گئے ہنہ۔۔۔" کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے وہ نکل بھی گئی۔ زبان ابھی بھی چل رہی تھی۔

انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کے چائے لبوں سے لگالی۔

"بہت بولتی ہے یہ مگر صحیح بولتی ہے۔ اور یہ خبریں۔۔"

نیوز اینکر کی سوئی پانامہ لیکس پر اٹکی ہوئی تھی۔ چائے کے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے ان کی سوچیں منتشر تھیں۔ دل میں پھر وہی بے یقینی آمیز افسردگی چھانے لگی۔ ٹی وی بند ہو چکا تھا۔ منجھلی نے

حسب عادت ہیڈ لائنز کا کہہ کر سارا بلیٹن سنا تھا۔ بچے ٹیوشن پر چلے گئے تھے۔ گھر میں خاموشی کا راج ہو گیا۔

پر اندر کا شور ان کی سماعتوں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

☆ ☆ ☆

"اللہ!" ثمین کا ہاتھ کھلے منہ پر جا کر ٹھہر گیا۔ یہ اس کے حیران رہ جانے کا مخصوص انداز تھا۔ "ساری دنیا جانتی ہے۔ امیتابھ بچن کے پاس دولت کے انبار ہیں اور بہو رانی کے پاس بھی۔۔۔ ان کا نام بھی آ گیا پاناما لیکس میں امی۔۔۔"

"یہ سوچو' کن کن کا نہیں آیا۔۔۔"

"اللہ۔۔۔ لوگ اتنی دولت کا کریں گے کیا۔۔۔؟ پیٹ تو بڑا نہیں ہو جائے گا۔ اس میں تو وہی ایک روٹی جائے گی۔"

"حرص کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔" وہ خود متاسف تھیں۔

"کس کے نام ہو گی یہ ساری جائیداد۔۔۔ ایک ہی تو بیٹی پیدا کی ہے ابھی اس ایشوریہ نے۔۔۔" ثمین کی نگاہ ہر پہلو پر تھی۔

"ایسا کرتے ہیں فیس بک پر اسٹیٹس ڈال دیتے ہیں۔ درجن بھر بچے تو پیدا کرنے ہی چاہئیں اس کو۔" ثمر کی بیوی نے ٹکڑا لگایا۔ سب ہنس دیے۔

"ہاں جی وہ تو جیسے اسی مشورے کے انتظار میں ہے۔"

منجھلی بہو نے ریموٹ ہاتھ میں پکڑ کر کمانڈ سنبھال لی۔ اسے چینل سرفنگ کا بھی شوق تھا۔ ایک ہی وقت میں سارے ٹاک شو بھگتا لیا کرتی تھی۔ سب کی توجہ باتوں سے ہٹ کر خبروں کی جانب مبذول ہو گئی۔

ہر جگہ یہی خبر۔۔۔ چینلز کی تو مانو وہ مثال ہو گئی کہ سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا۔ ٹی وی پر اینکرز بپھرے' تجزیے کرنے لگے۔ ادھر گھر میں بھی سب اپنی اپنی رائے پیش کرتے۔

اظہر کے مزاج میں انتہا پسندی اور سختی کا عنصر غالب تھا۔ اس نے سیاست دانوں کے حوالے سے فوری فیصلہ دیا کہ "انہیں سیدھا سیدھا پھانسی دے دی جائے۔" اسے ملک کے پیسے کا غم کھا رہا تھا۔

ثمر ان اعداد و شمار کو گنوانے لگا جو باہر کرنسی رکھنے سے ملک کے لیے نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

ثمر کی بیوی کو نیا موضوع مل گیا تھا۔ اس نے دنیا سے بات شروع کی اور دین پر لا کر ختم کر دی۔ "دیکھ لینا! قیامت کے دن کیسے پکڑ ہو گی۔"

ثمین ہنس دی۔ "ہاں جی! بے بسوں کا آخری حربہ دے بددعاؤں پر بددعائیں' لے کوسنے پر کوسنا۔"

"ہاں تو ہیں ناں بے بس۔۔۔ ہوئے جو با اختیار چوک پر لٹکوا کر۔" آگے کے الفاظ احاطۂ تحریر میں لانے کے قابل نہیں تھے۔ جبکہ ادھر قوم کے درد پر اس کی آواز بھر آ گئی تھی۔

"یہ آف شور کمپنیوں کا کیا مطلب ہوتا ہے؟" وہ سب کی رائے سن رہی تھیں۔ اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔ سارے ہی اتنے عالم فاضل و عاقل موجود تھے۔

منجھلی بہو آگے آئی۔ گھر والوں کی قسمت کہ اس کے پاس ایم اے پولیٹیکل سائنس کی ڈگری تھی۔ کچھ اخبار بینی کا شوق۔۔۔ اور ٹی وی پر نیوز چینل۔۔۔

"تم کچھ نہیں بول رہے ثمامہ؟" ثمین ہی کو دھیان آیا کہ ثمامہ بڑی دیر سے چپ ہے۔ سب ہی کی نظر اس پر اٹھ گئی۔ جو پیالہ بھر کے کٹے ہوئے تربوز لیے بیٹھا تھا۔ منہ بھرا ہوا تھا لہٰذا جواب دینے میں کچھ وقت لگا۔

"کیا بولوں' میں تو سننے والا ہوں۔"

"پھر بھی کوئی رائے تو ہوتی ہے۔" منجھلی بھابھی نے کہا۔

"بھئی۔ آپ سب جو کہہ رہے ہیں' میں اس سے صد فی صد متفق ہوں۔"

"یہی کہ پھانسی دینی چاہیے؟" اظہر نے پوچھا۔

"یا ساری انویسٹمنٹ وطن واپس لانی چاہیے۔" ثمر بھائی نے کہا۔

"سب کا احتساب ضروری ہے بھئی۔" ثمر کی بیوی

نے مدبرانہ انداز اختیار کیا۔

"اونہوں۔" ثمامہ نے پیالہ رکھ دیا۔ "میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ابھی تو آغاز ہے۔ کچھ وقت گزر جانے دیجیے ابھی اس پنڈورا بکس میں بہت کچھ باقی ہے۔ آپ سب تو ایک جھلک پر جلتے توے پر جا پہنچے ہیں۔ اس دہی کی لسی اب بڑی دیر تک بنے گی۔ سب کو حصہ ملے گا۔" وہ جیسے لطف اٹھا رہا تھا۔

"کیا مطلب...؟" اظہر کی بیوی نے پہلی بار لب کشائی کی کوئی سو جملے بولے تو اس کے منہ سے دو لفظ نکلا کرتے تھے۔

"مطلب یہ کہ... ہمیں تو آپ چپ ہی رہنے دیں۔ ورنہ... ذکر چھڑ گیا تو کئی پردہ نشینوں کے نام آئیں گے۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔

"پردہ نشین... کون پردہ نشین؟ ہم کیا بات کر رہے ہیں اور تم کیا..." ثمین بولی۔

"اسی لیے... کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا ناں، اسی لیے کہہ رہا تھا مجھ سے تو کوئی پوچھے ہی نہ۔"

"او بھائی! کسی ٹاک شو میں نہیں بیٹھے، جو بولنا ہے بول دو۔" ثمر بھائی نے لاپروائی سے دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے لے جا کر انگڑائی لی۔

"بول دوں؟" ثمامہ کی نگاہوں سے چھلکتی معنی خیزی نے سب کو چونکایا۔

"جانے دیں اسے آپ سب... یوں ہی سسپنس کری ایٹ کرنے کے لیے آنکھیں مٹکا رہا ہے۔" ثمر کی بیوی نے ہاتھ لہرایا۔

"میں تو آنکھیں مٹکا رہا ہوں... بول پڑا تو کئی لوگ ننگی کا ناچ ناچنے لگیں گے۔ آپ کی قسم..." وہ بڑی ادا سے خمیدہ ہوا۔

"ہٹو بھی تم اور تمہاری قسمیں۔" ثمر کی بیوی نے لاپروائی سے پیر پسارے۔

"اسی لیے تو چپ ہوں بھابھی حضور... اگر بول پڑا تو سب بولیں گے کہ بولتا ہے۔" وہ گنگنایا۔

"مجھے تو بھئی نیند آنے لگی ہے۔" اظہر کی بیوی نے بتایا سب کو، دیکھا صرف اظہر کو۔ اور اظہر، بیوی کی آنکھ کا اشارہ سمجھنے والوں میں سرفہرست تھا۔ اسے منہ پر ہاتھ رکھ کے جمائیاں روکنی مشکل ہو گئیں۔

ثمامہ نے شانے اچکائے۔

"بات یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی دودھ کا دھلا نہیں ہے۔ اس حمام میں سب کے سب... (اس نے قصداً" جملہ ادھورا چھوڑا) کیا چھوٹا کیا بڑا..."

"جو بہت بڑے ہیں، وہ بڑے ہاتھ مارتے ہیں، جو چھوٹے ہیں وہ اپنے قد کی مناسبت سے... پیچھے کوئی نہیں رہتا۔ موقع پرستی برائی نہیں خوبی ہوتی ہے۔ آپ نے صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کیا... مال بنانے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے اور مال بچانے کا بھی وہی وقت..."

"اتنی لمبی تقریر ثمامہ! تم تو بہت اچھا بولتے ہو۔" اظہر کی بیوی اس کے چپ ہونے پر بولی۔

"صرف اچھا نہیں بھابھی سچا بھی!"

"تمہیں کسی چینل پر نیوز اینکر ہونا چاہیے۔" منجھلی بھابھی نے رائے دی۔

"نہیں... مارننگ شو ہوسٹ بن جائے، اسے ناچنا بھی آتا ہے۔" ثمر کی بیوی نے اس کے ملٹی ٹیلنٹڈ ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن وہ برا مان گیا۔ نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں... میں منافق نہیں ہوں۔"

"کیوں؟ وہ سب منافق ہیں جو روز صبح..." ثمر کی بیوی نے پوچھا۔

"اوہ..." ثمر سوچ میں ڈوبا۔ "سب تو نہیں... مگر... چند ایک تو... ہاہاہا۔" وہ ہنس دیا۔ "دیکھتے ہیں اس پاناما لیکس کا کیا ہو گا... اس سے پہلے وکی لیکس تھیں اور اس سے پہلے کوئی اور... دراڑیں تو ہر دیوار میں ہوتی ہیں۔ کچھ نہ کچھ لیک ہو ہی جاتا ہے۔" اظہر کی بیوی نے نکلتے نکلتے آج کے دن کا سب سے خاص جملہ کہا۔ سب اش اش کر اٹھے۔

"واہ بھابھی!" ثمامہ نے سراہنے میں تنگ دلی کا مظاہرہ نہ کیا۔ "بہت اعلا... لیکن ابھی آپ نے ثمامہ

لیکس کے بارے میں نہیں سنا۔ ایک بار اگر ادھر سے کچھ لیک ہوگیا۔ تو کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔"

"کیوں تمہارے پاس کیا ہے؟" منجھلی بھابھی کے کان کھڑے ہوئے۔ باقی بھی چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"یہ پوچھیے کیا نہیں ہے۔"

چلو بتادو۔۔۔ کیا نہیں ہے۔" اظہر کو دلچسپی محسوس ہوئی۔

"پھر کبھی سہی۔۔۔"

"ابھی کیوں نہیں؟" ثمر کے لب بھی کھلے۔

"وہی ڈر کے مارے۔ ہنگامہ نہ مچ جائے گا ناں۔" اس نے آنکھ ماری۔

"سمجھا کریں یار۔"

اور اس کا انداز کچھ چونکاتا ہوا سا تھا۔ دل چاہنے کے باوجود موضوع بدلنے کی خواہش ہونے لگی۔ اظہر، بیوی کے ہمراہ کمرے سے نکل گیا۔ ثمر کی بیوی صوفے کے بے ترتیب کشن ٹھیک کرنے لگی۔ منجھلی چائے کے برتن اٹھالے گئی۔ ثمامہ جھک کر اپنے جوتے کی لیس باندھنے لگا۔ یوں ہی دوستوں کے ساتھ پان کھانے جانے کی عیاشی۔ بس ایک ثمین تھی جو اسے اندر تک جانتی تھی۔ کچھ تو تھا جس کی پردہ داری تھی۔ ثمامہ فضول نہیں بولتا تھا۔ ایک وہ تھیں جو ملکی حالات پر افسردہ ہوچکی تھیں۔ اور سب سے بڑے ثمر بھائی۔۔۔ جو بہت عجیب سی نگاہوں سے ثمامہ کو دیکھتے جاتے تھے۔

☆ ☆ ☆

"تم کچھ بتا رہے تھے ثمامہ۔ بہتر ہے کہ اب منہ کھول دو۔" یہ ثمین کی آواز تھی۔ "منہ کھول دوں، تم نے میرے دانت گننے ہیں۔"

وہ واقعی اسے گھما رہا تھا۔ اپنے کمرے کے باہر تخت پر دراز فرحت آرا کو دونوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

کچھ دیر پہلے وہ ثمر کی بیوی اور منجھلی کے ساتھ نزدیکی مارکیٹ جانے کے لیے نکلی تھیں۔ مگر آدھی گلی تک پہنچتے ہی جانے سے منع کردیا کہ گرمی بہت زیادہ تھی اور گھٹنوں کا درد زیادہ محسوس ہونے لگا تھا۔ انہیں گھر میں پہننے کے لیے سوفٹی درکار تھی۔

"تم لوگ ہی لے آنا۔۔۔" وہ واپس آگئیں اور اسی میں ہانپ گئیں۔ برآمدے کے تخت پر پڑ گئیں۔ اندر کمرے میں ثمین اور ثمامہ ایک ہی گول تکیے پر سر ٹکائے نیم دراز تھے۔ درمیان میں جامن کی پلیٹ رکھی تھی۔

دونوں مقابلے پر تلے تھے۔ بچپن کی عادتیں۔۔۔ اتنے بھرے پرے گھر میں بھی ان دونوں کا اپنا ہی اکیلا ساتھ تھا۔ جس میں وہ کم ہی کسی کو شریک کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے دوست 'رازدار۔

تو وہ جو انہیں محسوس ہوا تھا کہ ثمامہ کچھ چھپا رہا ہے یا بتانے سے ہچکچا رہا ہے تو ویسا حقیقت میں تھا بھی۔۔۔ جب ہی تو ثمین پوچھ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے دل کی باتیں بنا کہے جان لیتے تھے۔

"بتادو ثمامہ۔۔۔ کیا ہے یہ ثمامہ لیکس؟" ثمین کا لہجہ ملتجیانہ ہوگیا۔

"کیا کروگی جان کر۔۔۔؟" ثمامہ کی بھی بس ہوچکی تھی۔ یوں بھی ثمین سے کب تک چھپا سکتا تھا جبکہ دل کہتا تھا۔ رحم کرو' تھوڑا بوجھ کم کرو۔

"یہ ثمامہ لیکس نہیں ہے بیسکلی (بنیادی طور پر) یہ شاہانہ لیکس ہیں۔۔۔ البتہ کنفرمیشن اور تحقیق میں نے بعد میں خود کی ہے۔"

"پر لیک کیا ہے؟" اس نے اصل سوال کیا۔

"لئیق بھائی کے بڑے بھائی جنہوں نے ابھی اپنا گھر توڑ کر چار منزلہ بلڈنگ بنائی ہے۔" ثمامہ نے بولنا شروع کیا۔ وہ شاہانہ باجی کے شوہر کے حوالے سے بات کررہا تھا یعنی شاہانہ لئیق کے جیٹھ۔۔۔

"ہوں!" ثمین نے سرہلایا۔ "فرش پر ماربل لگوانے کے لیے ماربل مارکیٹ گئے تو۔۔۔ جس دکان سے سودا ہوا' اس کے دو مالک تھے۔ پارٹنرشپ پر کام ہورہا تھا وہاں۔" ثمامہ کا لہجہ دھیما ہوگیا۔ دو میں سے

ایک پارٹنر ثمر بھائی تھے۔

"ثمر بھائی۔!" ثنین کے حلق میں جامن کی گٹھلی پھنسی۔ آنکھیں ابل پڑیں۔ ثمامہ اچھل کر سیدھا ہوا۔ دو تین مکے اس کی کمر پر برسائے۔

"تم لڑکیوں کو ذرا ذرا سی بات پر اوور ری ایکٹ کرنے کی عادت ہوتی ہے۔"

"یہ ذرا سی بات ہے ثمامہ؟" ثنین کی آواز بلغم زدہ تھی۔

"میں نے بھی سنی تھی بمشکل صبر سے اندر اتار لی۔"

"دلیق بھائی کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" ثنین کیسے یقین کر لیتی۔

"مجھے بھی یہی لگا تھا مگر میں نے گٹھلی پھنسانے کے بجائے تحقیق مناسب سمجھی۔"

"اچھا... پھر..." یوں ہی بکواس ہوگی' بلاوجہ کی شرمندگی' ثنین پر یقین تھی۔ "ثمر بھائی اور ماربل... پارٹنر شپ پر ملکیت... کہاں جی۔"

مگر ثمامہ کہہ رہا تھا۔ "ہاں جی۔"

"یہ کب ہوا؟"

"تین سال ہونے کو ہیں۔"

"مگر ان کے پاس کہاں سے آ گئے بزنس کے لیے پیسے۔" ثنین کی بکار عین فطری تھی۔

ثمامہ نے لاعلمی سے کندھے اچکائے۔ ثنین نے یک دم ثمامہ کا بازو دبوچا۔ وہ بمشکل سجدہ ریز ہونے سے بچا۔

"ثمر بھائی نے ہمیں کیوں نہیں بتایا ثمامہ...؟" اس کا لہجہ مدھم ہو گیا۔

بے یقینی' استعجاب' لاعلمی' صدمہ کیا کیا نہیں تھا اس کے لہجے میں' ثمامہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"بولتے کیوں نہیں۔"

"ابھی ثمامہ لیکس میں بہت کچھ باقی ہے۔ تھوڑا صبر تو کرو۔" اس کا لہجہ پر اسرار تھا۔

✡ ✡ ✡

اور ثمر نے کیوں نہیں بتایا تھا۔ تین سال کوئی کم مدت تو نہیں ہوتی۔ ہزار سے بھی زیادہ ایک بار بھی ثمر کو خیال نہ آیا کہ وہ ماں کو بتائے کہ۔

اور وہ ثمر... کون ثمر جو ہر کام شروع کرنے سے پہلے فرحت آرا سے استخارہ کرنے کو کہتا تھا۔ اچھا امی دعا کیجیے گا۔ ان کے پاس اکڑوں بیٹھ کر خود پر پھونکیں مروانے والے ثمر نے انہیں بتانا مناسب نہیں سمجھا... پر کیوں...؟

سوئی اٹک گئی تھی۔ وہ گھنٹوں سجدہ ریز ہو کر گڑگڑا کر اللہ سے ڈھیروں دعائیں کرتیں اور سب اولادوں میں برابر بانٹ دیتیں۔ نہ کم نہ زیادہ...

اظہر کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ وہ وظیفے کرتیں۔ تہجد میں جاگ جاگ کر اللہ سے اس کے لیے اولاد مانگتیں۔ کہیں سے کوئی تسبیح سن لیتیں کہ محبوب ہے وہ تسبیح پکڑ کر گوشہ نشین ہو جاتیں۔ کوئی وظیفہ' کوئی سورۃ کوئی آیت... کوئی طریقہ...

اظہر سے فارغ ہوتیں تو شاہانہ کے لیے دعا مانگتیں۔ اس کی اوپر تلے کی تین بیٹیاں تھیں۔ وہ ان کے رشتوں کے لیے ہلکان... کسی نے نصیب باندھ دیے میری بچیوں کے... امی آپ دعا کیجیے۔" شاہانہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتیں۔

"نصیب تو اللہ اپنے ہاتھ سے لکھتا ہے۔ اللہ کے کہے کو کوئی کاٹ نہیں سکتا۔ اور وقت بھی اللہ ہی طے کرتا ہے۔ صبر کرو۔"

"آپ دعا کریں بس۔"

"کرتی ہوں بیٹا..." وہ اپنی وظیفوں کی کتاب کے صفحے پلٹنے لگتیں۔

منجھلا بیٹا اشعر ملک سے باہر تھا۔ پردیس کا دکھ... نجانے کیسے رہتا ہوگا خود پکا تا کھاتا ہوگا۔ تھکا ہارا لوٹتا ہوگا تو پانی کا گلاس تک دینے والا کوئی نہیں۔ اوپر سے وہاں کے خراب حالات... کبھی کام لگ جاتا... کبھی چھٹ جاتا۔ کیسی ناآسودہ زندگی جی رہا تھا وہ... نہ وطن کا سکھ... نہ بیوی بچوں کی سنگت کا سکون نہ ماں کی میٹھی نظر کی چاشنی نہ رشتے نہ دوست...

گرم نوالہ منہ میں رکھتیں تو چبانا بھول جاتیں۔

اشعر ٹھنڈی اکڑی روٹی کھاتا ہوگا۔ کہنے کو کہہ دیتیں کہ آگ لگاؤ ان نوٹوں کو جن کی قیمت پر دل ہر وقت دکھا رہتا ہو۔ مگر کیسے کہتیں۔ کتنے سال پہلے وہ ملک سے نکلا تھا۔ اب تو یاد بھی نہیں۔ کہاں مل رہی تھی اسے یہاں ملازمت ڈبی جوتیاں چٹخاتا نوجوان۔۔۔ ثمر کو سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ مگر وہ تو بہت کم درجہ کی تھی۔ اشعر کا سبب بن گیا۔ وہ جاتے ہی سیٹ بھی ہوگیا۔

باپ کے اکاؤنٹ میں پیسے بھیجتا تھا۔ ثمر کی شادی کی۔ پھر نعمانہ کی شادی، پھر گھر بنانے لگے تب بھی اشعر نے پیسے بھیجے۔ اور وہ بہت پیسے بھیجتا تھا۔ مگر انہوں نے کبھی بھی "مال مفت دل بے رحم" والا معاملہ نہیں کیا۔ انہیں معلوم تھا۔ کتنے ہجر کاٹ کر خوشیوں سے وصال ہوتا تھا۔ پھر اب کچھ سالوں سے اشعر نے پیسے کم کرتے کرتے تقریباً "بند کردیے تھے۔

"حالات درست نہیں۔ اب سختی بہت ہے۔ کوئی جمع جتھا نہیں ہے۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ ان کی تعلیم پھر شادیاں اور پھر مستقبل کے لیے کوئی منصوبہ۔۔۔ اب میں اتنا نہیں کرسکتا امی۔۔۔

آپ اسی میں گزارا کریں اور یوں بھی آپ کا خرچا ہی کیا ہے۔"

وہ اس کی ساری باتیں دردمندی سے سن رہی تھیں۔ مگر آخری جملہ بری طرح چبھا۔۔۔ زندگی بھر گزارا ہی کیا تھا۔ شکر گزاری کے ساتھ۔۔۔ مگر یہ کیوں کہا کہ ان کا خرچا نہیں تھا۔ زندہ انسان کا خرچا ہوتا ہے اور ان پر تو ابھی دو بچوں کی ذمہ داری بھی تھی۔ وہی تعلیم، شادی اور ان دو خواہشوں سے پہلے زندہ رہنے کا سامان بھی تو چاہیے۔ اس زمانے میں زندہ رہنا کوئی آسان ہے۔"

"اوہ!" وہ چونکیں۔ یہ تو ثمر کی بیوی کا جملہ تھا جسے دن میں دوبار تو وہ لازمی دہرایا کرتی تھی۔

جب بچوں کا لنچ بنا رہی ہوتی۔ جب سبزی گوشت لاتی۔ جب اپنے بٹوے میں سے بچوں کو پینسل ربر کاپی یا پھر جیب خرچ دے رہی ہوتی۔

بولنا اسے بہت پسند تھا۔ اور ہر چیز پر، ہر بات میں اپنی رائے دینا پسندیدہ ترین۔

وہ دودھ کی بڑھتی قیمت پر آنسوؤں سے رو پڑتی تھی۔ بچے کپڑوں پر کوئی کھونچا وغیرہ لگا آتے تب لگتا بین ڈالنے لگے گی۔ بچوں کی کاپی پینسل کی فرمائش پر انہیں یوں دیکھتی جیسے وہ اس کا گردہ مانگ رہے ہوں۔

چھوٹی چھوٹی بات پر اسے پیسے کی تنگی یاد آتی اور۔

"کہاں سے کروں میں یہ سب پورا۔" جیسا جملہ بول کر سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ فرحت آرا کو بہت ترس آتا۔

وجہ، ثمر کی کم آمدنی۔۔۔ کتنے سال سے اس کا رکا پروموشن، تھی۔ پانچ بچوں کے ساتھ اس دور کی زندگی کو متوسط انداز سے جینے میں بھی اسے دانتوں پسینہ آتا تھا۔ تنخواہ کم تھی اس پر ستم بڑھتی بھی نہیں تھی۔ پھر دیر سے ملتی تھی۔ آدھی ادھوری ملتی تھی۔ نہ بونس نہ اوور ٹائم۔

اس پر ثمر کا پیار اسا دل۔۔۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود وہ ان کی دوائیں خود لاتا۔۔۔ وقت پر لاتا بنا ماتھے پر شکن لائے۔

وہ اسے منع کرنا چاہتی تھیں۔ تب وہ منہ پر ہاتھ رکھ دیتا۔ اس بارے میں وہ کچھ نہ بولیں گی۔ تب وہ اس محبت و فرماں برداری و ایثار پر سرشار ہو جاتیں۔ کیسے اتنی مشکلوں کے بیچ اس نے ماں کی دواؤں کو سب سے پہلے یاد رکھا ہوا تھا۔ کاش وہ کچھ کرسکتیں۔

ہاں۔ بس ایک وہ دعا کا نسخہ تھا۔

دعا۔۔۔ بس خالی ہاتھ پھیلا کر خالی ذہن و دل سے بھی اللہ کہہ دیا جائے تو سات آسمانوں سے اوپر پکار چلی جاتی ہے۔ اللہ کو کہانیاں سنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر وہ کھول کھول کر جزئیات سے بتاتیں۔

"اے اللہ۔۔۔ ثمر کی آمدنی بہت کم ہے۔ اور اس کے دفتر والے ذلیل ترین۔ تجھ کو تو پتا ہے، دودھ کتنا مہنگا ہوگیا۔ ہزار روپے کا ڈبا سات دن نہیں چلتا۔ اوپر سے اسکول کے خرچے۔۔۔ چار بچے اسکول جاتے ہیں۔ آگے کیا کہوں۔ تجھ کو سب پتا ہے میرے

مالک۔۔۔۔ میرے بچے کی ترقی کردیجیے۔

رزق میں کشادگی کی دعائیں پڑھتیں۔ وظیفوں کا ایک صفحہ مستقل زیر مطالعہ رہتا۔ نماز حاجت پڑھ کر گڑگڑاتیں۔ پرندوں کے لیے باجرہ رکھتیں آب خوروں کا پانی بدلتیں۔ صدقہ دیتیں۔ بس کسی طرح ثمر کی زندگی میں آسانی آجائے یا اسے اور کوئی اچھی نوکری ہی مل جائے۔

دعا لبی سے لبی ہوجاتی۔۔۔۔

مگر پھر ہار جاتیں۔ آخر کیا ہے جوان کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

انہیں اپنے صغیرہ کبیرہ۔۔۔۔ کردہ ناکردہ گناہ یاد آنے لگتے۔ چھوٹے چھوٹے بے ضرر سے۔۔۔۔ اور بڑے بھی۔۔۔۔ وہ گھنٹوں سوچتیں۔ معافی طلب کرتیں اور نئے سرے سے جملے بناتیں۔

مگر یہ تو اب پتا چلا۔ ثمر کے معاملے میں ان کی دعائیں نجانے کب سے قبول ہوچکی تھیں۔ اور وہ بھی شان دار طریقے سے۔۔۔۔ وہ اپنا خود کا بزنس چلا رہا تھا۔

ہاں وہ گھر میں خرچ کی مد میں وہی مخصوص طے شدہ رقم دیتا تھا۔ مگر ایک بے نیازی سی پرسکون کیفیت اس کی شخصیت میں نظر آنے لگی تھی۔ وہ اسے اپنی قبول ہوتی دعا سمجھیں۔ ہاں اے اللہ تو جس حال میں رکھ مگر سکون کے ساتھ۔ طمانیت کی نعمت سے مالامال رکھ۔

بچے اچھے لباس پہننے لگے تھے۔ ثمر کی بیوی کے تن پر اچھے کپڑے دیکھ کر وہ ماشاء اللہ کہتے ہوئے نگاہ چراتیں۔ نجانے کہاں سے پورا کرتا ہوگا وہ۔ ایک دو بار تمین کے متوجہ کرنے پر پوچھ بیٹھیں تو گھڑا گھڑایا جواب مل گیا۔ "بھائی نے بنا کردیا۔۔۔۔ امی نے لے کر دیا۔"

اور ماننے میں حرج نہیں تھا۔ ثمر کے سسرال والے پیسے والے لوگ تھے۔ انہیں بھی ثمر کے حالات کی تنگی کا اندازہ تھا۔

"لیکن۔۔۔۔" فرحت آرا نے آنکھ سے بہتے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کیا۔ "ثمر نے انہیں کیوں نہیں بتایا۔ اگر وہ بتا دیتا تو خدا کی قسم" وہ اس پوری دنیا کا واحد شخص ہوتیں جو سب سے زیادہ خوش ہوتا۔ تو ثمر نے ان ہی کو نہیں بتایا۔۔۔۔ بلکہ چھپا کر رکھا۔ آخر کیوں؟" ان کا دل مسلا گیا۔

"کیوں؟ وہ اس سے پوچھیں گی۔ ضرور ہی پوچھیں گی۔"

"آپ کچھ نہیں پوچھیں گی امی!" ثمامہ نے کہا۔

"مگر کیوں؟" ان کی احتجاجی پکار۔ بھرائی ہوئی۔

"اس لیے کہ میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ کیوں؟"

"تم؟"

"ہاں میں۔۔۔۔" وہ بہت پرسکون اور بے فکر تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

اور ثمامہ لیکسی میں صرف ثمر کے حوالے سے ہوش ربا انکشافات نہیں تھے اس نے تو سب کا کچا چٹھا کھول دیا۔

"ثمر بھائی کے سالے اور سسر نے رقم دی۔ دوسرا پارٹنر سالے صاحب کا دوست ہے۔ شروع میں منافع کی شرح بہت کم تھی۔ لیکن اب گاڑی چھکا چھک چل پڑی ہے امید ہے کچھ عرصے میں پارٹنر کا ٹنٹا بھی ختم ہوجائے۔"

"پر مجھے بتانے میں کیا حرج تھا؟" ان کا سوال وہیں اٹکا تھا۔

"صرف ثمر ہی نے منہ نہیں سی رکھا۔۔۔۔ اظہر بھائی بھی پیچھے نہیں ہیں۔"

"اظہر۔۔۔۔ مگر اظہر تو ماشاء اللہ اچھا کما رہا ہے پھر اس کا خرچا بھی کیا ہے۔" وہ سادگی سے بولیں۔

ثمامہ نے سر جھٹکا۔ وہ ماں کے سوالات کو نظر انداز کرتا بس واقعات سنانے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

"یہی تو بات ہے' وہ نہیں چاہتے کہ ان کی آمدنی جو سب کو یوں ہی فالتو کی لگتی ہے' اسے ضائع کیا جائے۔ اپنی بیوی کے نام پر یونی ورسٹی روڈ پر فلیٹ خریدا ہے۔"

"بیوی کے نام پر۔۔۔۔" ان کو ذرا یقین نہ آیا۔

"ہاں۔۔۔۔ بھابھی کا موقف ہے' ان کی کون سی کوئی

اولاد ہے۔ کل کلاں کو اظہر بھائی کو کچھ ہو جاتا ہے تو انہیں کس برتے پر اس گھر سے حصہ ملے گا۔ وہ کہاں دردر کی خاک چھانتیں گی۔ ان کے میکے میں کون ہے۔ جو پیر کے نیچے زمین اور سر پر چادر ڈالے گا۔ لہٰذا عقل کا تقاضا ہے وہ کچھ نہ کچھ سب جوڑ کر رکھیں۔"

(اللہ نہ کرے، جو اظہر کو کچھ ہو) ان کی مامتا کرلائی۔

"لیکن ثمامہ ' وہ ہمیں بتاتا تو کیا ہم فلیٹ پر قبضہ جما لیتے؟" ان کی سوئی گھوم پھر کے یہیں آ رکی تھی۔

"آپ سوال بہت کرتی ہیں امی۔" ثمین اس بے حد گمبھیر صورت حال میں بھی بے فکری سے فالسے کھانے میں مصروف تھی۔ "ابھی منجھلے بھائی کی کارکردگی باقی ہے۔"

"اس نے کیا کیا ہے؟" وہ پوری کی پوری ثمین کی جانب گھوم گئیں۔

"مسعود کی نیکسٹ کلاس میں ایڈمیشن کے لیے جہاں رجسٹریشن کروائی ہے وہاں منتھلی فیس چوبیس ہزار ہے اور ایڈمیشن کا سارا خرچا لاکھوں کی مد میں ہے۔ اگلے سال سمیعہ بھی اس اسکول میں جائے گی۔" ثمامہ نے پلیٹ سے فالسے چنتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

"لیکن اس کا تو ہاتھ تنگ ہے۔ آج کل کام ٹھیک نہیں۔ بیوی کو بھی کم خرچا بھیج رہا ہے اور میرے خرچ میں سے بھی کٹوتی کی ہے۔" میں تو دن رات اس کے لیے دعا مانگ رہی ہوں کہ اس کی مشکل دور ہو۔ وہ بمشکل آواز کو بلند رکھنے سے باز رہیں۔

"صرف یہی نہیں امی۔ منجھلے بھائی نے بحریہ ٹاؤن میں پلاٹ بک کروایا تھا۔ (پانچ سو گز کا۔ آدھے سے زیادہ تعمیر ہو چکا ہے۔ رہائش کے لیے سب سے پہلے جانے والوں میں ان کا نام ہوگا۔ وہ کہتے ہیں اتنے سال ملک سے باہر رہ کر تھک چکے ہیں' اب پرسکون زندگی گزارنے کے لیے پرسکون جگہ درکار ہوگی۔"

"تو کام کیا کرے گا ادھر آکر۔ نوکری نہ ملنے کی وجہ سے تو سالوں پہلے ملک چھوڑ کر گیا تھا۔ اب تو اور بے روزگاری ہے۔" وہ حیران تھیں۔

"نوکری کریں ان کے دشمن۔ وہ تو کاروبار کریں گے۔"

"کاروبار۔ تو اس کے لیے تو سرمایہ۔"

"ہے ناں۔ بہت ہے۔"

"مگر وہ تو کہہ رہا تھا کہ کوئی بچت نہیں۔ منجھلی بہو بھی اٹھتے بیٹھتے یہی کہتی ہے کہ جوانی کی کمائی تو سب بہن بھائیوں پر لگادی۔ اب خود کے بچے بڑے ہو رہے ہیں تو باپ کے اندر ہمت ختم ہو گئی اور میں مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی منہ چھپالیتی ہوں۔"

وہ زخمی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگیں۔ جو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر رہے تھے 'اتنا سچ بولنے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ بس کافی ہے۔'

"ان سب نے ایسا کیوں کیا ثمامہ۔؟"

"کچھ بھی نہیں کیا۔ اسے کہتے ہیں آف شور کمپنی۔ آف شور اثاثے۔"

ثمامہ نے مزے سے ثمین کو دیکھا۔ اس نے ہاں میں ہاں ملانے کے لیے زور شور سے سر ہلایا پھر ثمامہ کے تالی مارنے کے لیے بڑھاتے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس دی۔

"ثمامہ۔!" فرحت آرا نے صرف نام پکارا تھا مگر اس پکار میں کسی معصوم بچے کی لاچاری۔ غم اور خوف نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ دونوں بری طرح چونکے۔

"میں نے ڈھیروں نفل مان رکھے تھے۔ اگر ثمر کے لیے اللہ آسانی کردے۔ روزے بھی مانے تھے۔ خیرات بھی۔ مجھے اب وہ منتیں پوری کرنی پڑیں گی نا۔"

"اوہ اماں۔ ارے امی۔" دونوں ایک ساتھ ماں سے لپٹ گئے۔

"اماں!" ثمین نے فرحت آرا کے آنسو اپنی پوروں سے پونچھے "اب اتنی اتنی سی باتوں پر روئیں گی۔"

"ایسا تو ہوتا ہے۔ اب دنیا میں۔" ثمامہ کی دائیں آنکھ بار بار مچلتی تھی۔ فالسے کھٹے تھے۔ فرحت آرا نے سر اٹھایا۔

"ہاں ہوتا ہے... اب..." انہوں نے اب پر زور دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہاری تمام ضروریات کا خیال رکھنا میرا فرض ہے فرحت بیگم... مگر... مجھ پر میرے بہن بھائیوں اور ماں باپ کی بھاری ذمہ داری ہے... میرے ابا اب اتنی محنت نہیں کرسکتے۔ بڑا بیٹا ہونے کے ناتے میرا فرض ہے کہ میں ان کے کندھے سے کندھا جوڑوں۔ میری بات سمجھ رہی ہونا۔"

دلہن بنی فرحت کا سر اثبات میں ہلا۔

"میرا ساتھ دوگی نا؟"

فرحت کا سر دوبارہ ہلا۔ ہاں وہ دے گی۔

نہ شرط... نہ معاہدہ... بس دو سوال... دو جواب... اور زندگی کا اگلا لائحہ عمل طے ہوگیا۔

قربانی... ایثار... محبت... فرض اور فیصلہ...

شروع شروع میں پتا ہی نہ چلا... بن کہے ضروریات پوری ہوجاتی تھیں۔ باورچی خانہ ساس کی زیر نگرانی تھا۔ فرحت کو کسی بھی چیز کے ختم ہوجانے کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ اسے صرف کہنا ہوتا تھا۔ ساس فراہم کردیتیں' گھر بھر کی پسند کے لحاظ سے سبزی گوشت آجاتا... فرحت کو صرف پکانا ہوتا تھا۔

تقسیم کا کام بھی ساس کا تھا۔

دو چار سال تک تو بری جہیز کے سلے کپڑوں ہی نے بازاروں کا رخ کرنے نہیں دیا۔ پھر ان سلے کی باری آئی تو کئی سال گزر گئے۔ نہ ہی ان دنوں میں لباس' حرص و ہوس اور نمود و نمائش کی خواہش کو پورا کرنے کا ذریعہ تھا۔ ایک ضرورت' قناعت اور اعتدال کے ساتھ...

بچے پیدا ہوئے تو ساس' نندیں خود ہی چھوٹے چھوٹے نمونے بنا کر چاؤ سے بھتیجا' بھتیجی کو پہنانے لگیں۔ فرحت کو تو بس سجا بنا بچہ دکھائی دیتا۔

شوہر اپنے بہن بھائیوں سے خاصے بڑے تھے۔ وہ سب ابھی تعلیم کے مراحل طے کررہے تھے۔ جب سسر گزر گئے۔ سارا بوجھ شوہر کے کندھوں پر آگیا۔

سسر کم کماتے تھے' مگر وہ تھوڑی سی کمائی کتنی اہم تھی۔ اس کا اور اک سب ہی کو ہونے لگا۔ ادھر اپنے بچے اسکول جانے والے ہوگئے تھے۔ اسکول سرکاری تھا۔ مگر بڑھتی عمر کے بچوں کے مسائل آئے دن' جوتے چھوٹے ہوتے' یونی فارم ٹخنوں سے اوپر چڑھ جاتا۔

اور شوہر جیب خرچ کے نام پر چند روپے بھی دے نہیں پاتے تھے۔ ایک آدھ بار مانگنے کی جسارت پر وہ جس مشکل میں پڑتے دکھائی دیے' اس سے فرحت کا دل اور برا ہوا... شادی کے لیے تیار بہنیں' کالجوں میں جاتے بھائی' بیمار ساس جنہیں جسمانی بیماریوں سے زیادہ سوچوں' فکروں نے نچوڑ دیا تھا۔ کیسے ہوگا یہ سب پورا اور کون کرے گا... فرحت کا شوہر خود بال بچے والا... اس سے چھوٹی دو لڑکیاں اور پھر دو بیٹے جو پڑھ رہے تھے۔ پڑھائی سے وقت ملنے پر کچھ نہ کچھ ہاتھ پیر مار لیتے... مگر اونٹ کے منہ میں زیرہ...

ساس کروشیا کے فن میں طاق تھیں... بہت شوق سے سارا گھر سجا رکھا تھا۔ بیٹیوں کے جہیز بنا کر سنبھالے تھے۔ تحفے تحائف دیتی تھیں۔ اگر اسی ہنر سے چار پیسے کمالیے جائیں۔

ساس کے چلتے ہاتھوں اور چہرے کی طمانیت نے فرحت کو بھی مائل کیا۔ وہ بھی تو سلائی کے ہنر میں طاق ہے۔ مشکل سے مشکل ڈیزائن کو بھی بس ایک بار نظر بھر کے دیکھ لیتی تو اندر کی گم سلائی تک کو بھانپ جاتی۔

تو وہ کیوں ذرا ذرا سی چیز کے لیے شوہر کا منہ دیکھے۔ جب ہاتھ سچے ہیں تو اپنا خود کرے اس نے سلائی مشین سنبھال لی۔

زنانہ کپڑے سینے سے زیادہ مردانہ کپڑے آسان لگتے تھے۔ سیدھا سیدھا ایک ڈیزائن نہ فٹنگ کا جھنجھٹ نہ بیل' پائنچوں کے گھماؤ۔ یا تو کرتا... بین کالر تو بابا بازو۔ شرٹ کالر تو ساتھ میں کف۔ گھر کے باہر بورڈ لگا دیا۔

چھوٹے لڑکوں کے لباس تیار کیے جاتے ہیں۔

شروع میں صرف وہی عورتیں آئیں۔ جن کے سال بھر سے دس بارہ برس کے لڑکے تھے اور درزی اول تو

ان کے کپڑے پکڑتے نہیں تھے اور اگر پکڑ لیتے تو سلائی فل مردانہ سوٹ والی مانگتے۔ ایک نے دو کو بتایا اور دو نے چار کو۔۔۔ رش ہی لگ گیا۔ تمام شعر اور اظہر کے کپڑے سی سی کے ہاتھ پہلے ہی رواں تھا۔ اب جب باقاعدگی سے کام کیا تو نگاہ ٹکنی مشکل ہو گئی۔ جن بچوں کے کپڑے سل رہے تھے۔ ان کے اباؤں کے سوٹ بھی آ گئے۔

اپنی کمائی۔۔۔ اپنے ذاتی پیسے۔ جن پر کوئی حق نہیں جتا رہا تھا۔ وہ جیسے چاہے اور جہاں چاہے خرچ کر سکتی ہے۔ شروع کے دنوں میں شوہر کو بتا دیا کرتی تھی۔

"روز ایک سوٹ سلائی کروں تو اتنے۔۔۔ اور اگر دو کروں تو اتنے۔۔۔ اور آپ کو پتا ہے' میرے پاس کتنے پیسے جمع ہو گئے ہیں۔" وہ بچوں کے سے انداز میں پوچھتی۔۔۔ شوہر نفی میں سر ہلاتے۔

"ارے!" وہ ہنستی۔۔۔ "سمجھ میں نہیں آتا' اتنے سارے پیسوں کا میں کروں گی کیا۔ بہت زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے تو بس تھوڑے سے ہی چاہیے تھے۔"

شوہر اس موہ لینے والی معصوم سادگی پر مسکرا دیتے۔ قناعت پسندی بھی کیا مشکل میں ڈال سکتی ہے؟ یا پھر فرحت جیسے لوگ۔۔۔ سادہ سے۔۔۔ شکر گزار بندے۔

"یہ تمہارے پیسے ہیں فرحت! تمہاری محنت اور ہمت۔۔۔ مجھے یا کسی کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں کہ کتنے کما رہی ہو اور کہاں خرچ کر رہی ہو۔ مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے' بلکہ میں تو شرمندہ ہوں کہ۔۔۔ تم جن تھوڑے سے پیسوں کا ذکر کر رہی ہو کہ تمہیں چاہیے تھے' میں تمہیں مہیا نہیں کر سکا۔"

فرحت تیزی سے نفی میں ہلاتے ہوئے شوہر کو منع کرنا چاہ رہی تھی' مگر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کا اور فقط سننے کا کہا۔

"فرض تو میرا ہے نا۔۔۔ مگر کیا کروں' سب کچھ تو تمہارے سامنے ہے نا' مجھ پر بڑی ذمہ داریاں ہیں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔۔۔" فرحت کے لیے مزید چپ رہنا مشکل تھا۔ "مجھے تو خود پر غصہ ہے' میں نے اتنی دیر کیوں کر دی۔۔۔ بلاوجہ محتاجی رہی' دل مارنا پڑا۔۔۔ مجھے تو آپ کے کندھے سے کندھا ملانا چاہیے تھا۔"

"وہ تمہیں۔۔۔ اول تو میں چاہتا ہی نہیں کہ تم اس طرح خود پر بوجھ ڈالو' تمہیں گھر بھی دیکھنا ہے اور بچوں کو بھی سنبھالنا ہے۔ تم تھک جاؤ گی فرحت۔۔۔"

"یقیناً" تھکوں گی' اگر جو آپ کو احساس نہیں ہو گا تو۔۔۔"

"مجھے احساس ہے' جب ہی تو۔۔۔ منع کر رہا ہوں' اتنا مت پھیلاؤ کام کو کہ۔۔۔"

"میں کام نہ کروں؟"

"ضرور کرو۔۔۔ میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو عورتوں کو گھٹن زدہ زندگی دے کر اپنی مردانگی کا علم بلند رکھتے ہیں۔ تم چاہتی ہو تو ضرور کرو۔۔۔ مگر مجھے مت بتاؤ' تم کمانے اور خرچ کرنے میں خود مختار ہو۔ بلکہ اگر صاف کہوں تو میں شرمسار ہونے کے ساتھ ساتھ شکر گزار بھی ہوں۔ تم نے وہ محاذ سنبھال لیا جو سب سے ضروری تھا۔ مگر مسلسل نظر انداز ہو رہا تھا۔ بچوں کی تعلیم' ان کی خواہشات' ضروریات اور خود تمہاری اپنی بھی تو بہت سی خواہشیں ہوں گی۔ منہ سے کہتی نہیں ہو تو کیا مطلب ہے خواہشیں سر اٹھاتی بھی نہیں۔

مجھ پر بہن' بھائیوں کی ذمہ داری ہے۔ اتنی کہ بہنوں کو رخصت کروں بھائی اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں اور ماں۔۔۔ ماں کی ذمہ داری ختم ہونے کی ڈیڈ لائن موت ہے۔ ان کی یا میری۔۔۔"

"او خدا۔۔۔ کیسی باتیں کرتے ہیں۔" فرحت نے شوہر کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا اور شروع میں بہت زیادہ بلکہ یوں ہی فالتو لگنے والے پیسے تو بہت تھوڑے تھے۔ ان ضروریات کے سامنے جو بڑھتے ہوئے بچوں اور گرانی کے ہاتھوں سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں۔

شوہر کے ساتھ ساتھ فرحت کو ساس کی اجازت بھی درکار تھی۔ ساس نے پیٹھ ٹھونکی' کامیابی کی دعا دی' مگر ساتھ ہی نصیحت بھی کی۔

"جو کرو گی اپنے بچوں کے لیے کرو گی' مگر ایک بات یاد رکھنا' شوہر کی مشکلوں میں شانہ بہ شانہ چلنا اور بات ہے' مگر اتنا ہی بوجھ اٹھانا جتنا برداشت کر سکو' یاد رکھو' مرد کے منہ کو ایک بار عورت کی کمائی کا چسکا لگ جائے... مانو منہ کو خون لگ گیا۔ خود کفیل ہونا اچھی بات ہے' مگر شوہر کی لگام کو کبھی ڈھیلا نہ چھوڑنا۔"

"یہ آپ اپنے بیٹے کے لیے کہہ رہی ہیں اماں...!" فرحت کی ہنسی بھری آواز میں حیرت کا عنصر غالب تھا۔ ساس نے منہ بنا کر طبیعت صاف کر دی۔

"تو میرا بیٹا تو لاکھوں میں ایک ہے۔ میں تو نصیحت کر رہی ہوں۔ اپنے پلو سے باندھ لو... وقت پڑنے پر ایک ایک گانٹھ کھولتی جانا اور بیٹیوں' بہوؤں کے پلوؤں پر باندھتی جانا... ہر نصیحت ہر ایک کے لیے نہیں ہوتی۔ مگر نصیحتیں یاد رکھنی چاہئیں' ہر ایک کو ہمیشہ... سمجھیں۔"

"سمجھ گئی' بالکل سمجھ گئی۔" فرحت نے تابع داری سے سر ہلایا۔

اور پھر زندگی نے نئے انداز سے آغاز کیا۔ وہ گھر ہی میں رہتی' مگر بالکل ایک ورکنگ وومن کی طرح... ساس اور نندوں نے اس کی بیشتر ذمہ داریاں آپس میں بانٹ... بلکہ وقت ملتا تو اس کے سلائی کے کاموں میں بھی مدد کر دیتیں۔ فرحت نے بچے سرکاری اسکول سے ہٹا کر پرائیوٹ انگلش میڈیم میں ڈال دیے... گھر کے سلے بستوں کی جگہ... پیارے رنگوں والے بیگز خرید کر وہ کتنی دیر تک انہیں گود میں لے کر دیکھتی رہی... شلوار قمیص والے یونی فارم کی جگہ پینٹ شرٹ پہن کر تینوں بیٹے پرنس لگتے تھے۔ بچیوں کے لیے ریڈی میڈ کپڑے' کھلونے اپنی وہ ضروریات اور خواہشات جنہیں وہ اندر ہی اندر گھونٹ دیتی تھی۔ انہیں پورا کرنے میں اب وہ بااختیار تھی۔

اس نے قناعت اور اعتدال کا دامن نہ چھوڑا' مگر ایک اعتماد' ایک خوشی اور ایک بے فکری نے زندگی کو آسانی فراہم کر دی تھی۔

انسانی مزاج بھی عجیب ڈھنگ کا ہوتا ہے۔

آپ ایک چیز خریدنا چاہتے ہیں' مگر آپ کے پاس مطلوبہ رقم نہیں ہے' آپ اتنے دکھی اور زود رنج ہوں گے کہ خود کو ہر پل مرتا محسوس کریں گے۔ آپ کے پاس قوت خرید ہے۔ آپ بے نیازی سے خواہشوں کو نظر انداز کر دیں' تب دکھ نہیں ہوتا۔ نہیں تو نہ سہی...

فرحت نے نئی چیز سیکھی۔

شوہر صاحب نے اس کی آمدنی کو ہاتھ لگانا بھی حرام سمجھا تھا' مگر خرچ تو وہ ان ہی کے گھر میں ہوتی تھی۔ ایک خوش حالی کی چمک نمایاں ہونے لگی۔ انہیں صرف پتا چلتا۔ فلاں چیز آگئی ہے۔ فرحت نے ان سے کہنا چھوڑ دیا تھا۔ جب اللہ نے اسے خود اس قابل بنا دیا تھا تو... وہ کیوں کہتی' دیکھیں میں کیا کر رہی ہوں... اور آپ کیا...

کچھ عرصے کی بچکانہ خوشی کے بعد فرحت کو رقم پس انداز کرنے اور کام کو بڑھانے کا خیال آیا۔ شوہر اچھا مشورہ دیتے تھے اور کسی بھی قسم کی مدد کے لیے بھی حاضر تھے۔ دیور بھی مددگار تھے۔ شروع شروع وہ سب سے مشورہ و مدد لے بھی لیتی' پھر یہ ہوا کہ خود فیصلے کرنے لگی۔ چند لڑکیاں اور مشینیں رکھ لیں۔ اسے شہر کی چند بڑی دکانوں سے بچوں کے شلوار سوٹ کے آرڈر ملنے لگے تھے۔ وہ لوگ خود مال پہنچا دیتے' مال اٹھوا لیتے۔

اس نے بچوں کی اعلا تعلیم کا خواب دیکھا تھا اللہ نے اس کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔

ادھر شوہر صاحب کی ذمہ داریاں مہنگائی کے ساتھ بڑھتی جاتی تھیں۔ وہ اپنی جاب کے علاوہ بھی کچھ ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔

فرحت کو وقتاً" فوقتاً" پتا چلتا چھوٹے موٹے کچھ کام... تمام پیسے ماں کے ہاتھ میں رکھتے۔ بہنوں کو ایسا شان دار جہیز بنا کر دیا کہ دنیا تو دنیا خود فرحت بھی دنگ رہ گئی۔

"وہاں سے لائے آپ اتنے پیسے... ادھار پکڑا ہے؟"

"پاگل ہو گئی ہو۔۔۔ تم جانتی ہو۔ مجھے ادھار سے کتنا خوف آتا ہے۔"

"پھر۔۔۔"

"یار۔۔۔ تم آم کھاؤ، پیڑ کیوں گنتی ہو؟"

"آپ کو بتانا ہوگا۔" وہ بس جان لینا چاہتی تھی۔

"ایسے ہی اندازے لگا لگا کر سر دکھ گیا۔"

شوہر ہنس پڑے۔ "مت کرواتنی مشقت۔۔۔ ایک دوست کے ساتھ اس کے کاروبار میں شراکت کی۔ سارا کام تو اسی کا ہے۔ میں نے تو بس اس کی مشکل میں اسے رقم فراہم کی۔ ادھار کی مد میں۔۔۔ وہ واپس نہیں کرسکا تو اس نے مجھے آفر کردی، تھوڑا بہت ہو گیا۔

پھر اسی طرح ایک جاننے والا سرکاری ٹھیکوں پر کام لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہفتہ اتوار کو ٹائم لگا کر چار پیسے کما لیے۔

ابھی ایک دوست بتا رہا تھا' اسے کباڑ سے اے سی وغیرہ خرید کر بیچنے کا بڑا تجربہ ہے۔ مگر سرمایہ کم ہے۔ سوچ رہا ہوں' اس کے ساتھ مل جاؤں' کچھ رقم ہے میرے پاس۔۔۔ کچھ کا بندوبست وہ کرے گا تو ان شاء اللہ۔"

"اللہ!" فرحت کا منہ اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ "آپ اتنا سب کچھ کر رہے ہیں۔۔۔ جب ہی گھر کو بالکل وقت نہیں دیتے۔ آپ تھک نہیں جائیں گے اتنی مشقت کر کے۔۔۔" وہ مختلف کیفیات کا شکار تھی۔

"نہیں تھکوں گا۔ تم تھکتی ہو کیا؟"

"نہیں' میں نے کیوں تھکنا ہے۔ میرا کام تو آسان ہے۔ دوسرے اپنے بچوں کے لیے کام کرنے سے بھی کوئی تھکتا ہے۔" اس نے الٹا سوال کر دیا۔ شوہر مسکرا دیے۔

"درست! اپنے گھر والوں کے لیے کام کرنے سے بھی کوئی تھکتا ہے؟" انہوں نے اسے لاجواب کر دیا۔

وقت گزرنے لگا' دونوں اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے انداز سے محنت کرتے رہے۔ شروع میں فرحت کی خواہش بس تھوڑی سی آسانی اور چند چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا حصول تھا۔ مگر پتا ہی نہ چلا کب وہ ہر چیز میں حصے دار بنتی چلی گئی۔

دوسری نند کی شادی آئی تو اس نے بغیر کہے ایک لفافہ ساس کے حوالے کر دیا۔ وہ متامل تھیں۔ مگر فرحت بھی ٹھان کر آئی تھی۔

دیور کے ملک سے باہر جانے کے لیے پیسوں کی ضرورت پڑی۔ بات ادھار پر آکر رک گئی۔ فرحت نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے پہلے پوٹلی شوہر کو تھما دی۔ گھر کی بالائی منزل پر کام شروع ہوا۔ فرحت پہنچ گئی۔

شوہر صاحب نے کچن بنا دیا' مگر اسے امریکن شکل دینے کے لیے فرحت نے اپنے اثاثے شو کر دیے۔ واش روم میں پسندیدہ ٹائلز۔۔۔

بچوں کا اچھے تعلیمی اداروں میں داخلہ۔۔۔ اشعر کی باہر جانے کی تگ و دو خاندان بالخصوص میکے کا لین دین۔۔۔

"تم اتنے پیسے کما لیتی ہو فرحت؟" شوہر صاحب کے منہ سے ایک روز نکل ہی گیا۔

"ارے!" وہ ہنسی "آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ بھول گئے' مجھے تو زکوۃ دینا واجب ہے۔"

"نہیں' وہ تو یاد رہا' مگر پھر بھی۔۔۔ دراصل میں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ۔۔۔"

"اچھا کیا' نہیں سوچا۔۔۔ میں جو کرتی ہوں۔" "اپنے بچوں کے لیے کرتی ہوں۔"

"ہاں۔ معلوم ہے' بس دیکھ رہا ہوں۔ ایک سلائی مشین سے تم نے اتنا کمال کیسے کر دیا۔" شوہر کے استعجاب میں سادگی و لاعلمی کا رنگ نمایاں تھا۔

فرحت مسکرا دی۔۔۔ "ایک سلائی مشین والی بات تو پرانی ہو گئی۔ جناب اب تو پورے دو کمروں میں پوری آتی ہیں مشینیں۔"

"ہاں۔۔۔ یہ تو مجھے معلوم ہے' مگر بات شروع تو ایک مشین ہی سے ہوئی تھی۔ اس لیے کہ گنتی ہمیشہ ایک سے شروع ہوتی ہے۔"

"اتنے پیسوں کا کیا کرو گی؟" ان کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ تھی۔

"کیا کروں گی، ضرورت مندوں کی مدد کروں گی۔ بس کوئی اچھا سا ضرورت مند مل جائے جس نے سفید لان کا کرتا پہن رکھا ہو کلف لگی شلوار اور مونچھیں گھنی گھنی ہوں۔" وہ شوہر کو بغور دیکھ رہی تھی۔

"شکل دیکھ کر دو گی؟" وہ سب سمجھ رہے تھے۔

"شکل دیکھ کر ہی ہمیشہ دیا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے دہری ہو گئی۔

اور وقت گزرتا گیا۔ بچے بڑے ہو گئے۔ سب بہن، بھائی بخیر و خوبی اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے۔ ساس دعائیں دیتی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ زمانہ آگے بڑھ گیا تھا۔ وقت کا پہیہ اب زیادہ تیزی سے گھومنے لگا تھا۔ گزرتے وقت نے ضروریات کو لامحدود کر دیا تھا۔

وہ دونوں اب بھی اسی تن دہی سے محنت کرتے تھے۔ اپنی تنخواہ اور چھوٹے موٹے کام۔ گھر گھر چلتی مشینیں... دونوں کے الگ الگ کھاتے تھے۔ الگ حساب کتاب... دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے مانگے نہیں، چھینے نہیں... نگاہ تک نہ رکھی... مگر خرچ اسی ایک گھر پر کرتے رہے۔ وہ اپنے حساب سے... فرحت اپنے حساب سے...

ظاہر کر کے کمایا... یا چھپا کر... سب شو ہو جاتا۔ جب گھریلو ضروریات سامنے آجاتیں۔

ان کی بیٹی شاہانہ کی شادی گھر کی پہلی شادی تھی۔ شاہانہ کا مزاج بھی شاہانہ تھا۔ اسے شادی بھی شاہانہ چاہیے تھی۔ باپ نے فرض سمجھ کر سب نپٹایا، کوئی کسر نہ چھوڑی۔ فرحت نے بیٹی کے دل کے ہر ارمان پورے کیے۔ جہاں باپ کا ہاتھ جیب سے خالی آیا۔ وہاں فرحت نے بٹوے کا منہ کھول دیا۔

پھر اشعر کا باہر جانے کا شوق... شوہر کی ریٹائرمنٹ... فرحت حاضر... کس لیے کمایا تھا اور کس لیے بچایا تھا۔ اسی دن اور ایسے ہی کسی کڑے وقت کے لیے نا...

نغمانہ کی شادی میں فرمائشوں کی سیریل نہیں تھی۔

مگر ایک بیٹی کے لیے اتنا سب اور دوسری کے لیے... اوں ہوں۔ ایسی ناانصافی تو مزاج کا حصہ ہی نہ تھی۔ بچے جوان ہو گئے تھے۔ تعلیم مکمل تھی۔ ایسی کوئی مشکل نظر تو نہیں آتی تھی، ہاں بڑھاپے کی دو اولادیں... دیگ کی کھرچن... ثمامہ اور ثمین... وہ ابھی بہت چھوٹے تھے۔ (شاہانہ کی بیٹیوں سے دو چار برس ہی بڑے تھے۔ یہ جڑواں ماموں خالہ...)

مگر شوہر صاحب نے دھوکا دے دیا۔ زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ پر یہ کیا... بیچ راستے میں داغ مفارقت دے گئے۔

یہ فرحت کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ ابھی تو بہت کچھ باقی تھا۔

صرف اشعر بیاہا تھا اور شاہانہ، نغمانہ... وہ سب کچھ کیسے کرے گی۔ کہنے کو وہ گھریلو سطح کی بزنس وومن تھی۔ مگر بزنس کی حد کیا تھی۔ مال آگیا، مال پہنچا دیا، کہانی ختم... اسے آج بھی نہیں پتا تھا۔ دنیا باہر سے کیسی ہے۔

فرحت کو شوہر کی موت نے مالی مصائب سے دوچار نہیں کیا۔ مگر وہ دھچکا جو ذہن و دل کو اور روح کو پہنچا تھا۔ بھلا ایسے بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی ایسے بھی کرتا ہے۔ وہ کیسے کرے گی۔ بچوں کی زندگی کے فیصلے...

ابھی تو کچھ عرصہ ہوا تھا۔ جب اتنے طویل سال کی ازدواجی رفاقت میں باتیں کرنے کا مزہ آنے لگا تھا۔ ورنہ باتوں کے زمانے کو تو رہٹ کے بیل کی طرح پٹی بندھی آنکھوں کے ساتھ جدوجہد کرنے میں گزار دیا تھا۔

اتنے سالوں کا ساتھ یوں تھا جیسے دو شناسا دریا کے دو کناروں پر برابر چلتے ہوں۔ اب یہ ہی تو وہ وقت آیا تھا۔ جب دریا کے دونوں کنارے ایک ہونے لگے تھے۔ اور یہ سب ہو گیا۔

کیوں ہو گیا میرے اللہ... فرحت اس صدمے سے ابھر ہی نہ پا رہی تھی۔ دن بہ دن بدحالی کی جانب مائل... اعصاب جواب دے گئے۔

مگر اس کا مسئلہ بے یقینی تھا۔ نہ جانے کتنا وقت لگتا

تھا، یقین کی منازل طے کرنے میں۔ ابھی تو دل ہی نہیں لگتا تھا اور دل کا لگنا اہم چیز ہے۔ مشینیں رک گئیں۔ رک کے رک کے جام ہو گئیں، یہاں تک کہ زنگ لگنے لگا تو لگتا رہا ہے، جب دل ہی نہیں لگ رہا تو۔۔۔

اشعر باہر سے پیسے بھیجنے لگا۔ ثمر کو بھی ملازمت مل گئی۔ بیٹوں ہی نے کہا۔ اب ماں کو مشقت کرنے کی کیا ضرورت ہے اور وہ فوراً" ایمان لے آئی۔

"ہاں تا ٹیوں کرے اب وہ محنت۔۔۔ وہ کندھا ہی نہ رہا۔ جس سے کندھا ملانے کے لیے اپنا سکھ، آرام اور جوانی گنوائی تھی۔ وہ قدم ہی پیچھے کہیں رک گئے۔ جن سے ہم قدم ہونے کی خواہش نے دوڑایا تھا۔

جسمانی تھکن کے بہتیرے علاج۔۔۔ فرحت کی روح شل ہو گئی تھی۔

سو زندگی اب فقط ایک جملہ تھی۔۔۔ بس۔۔۔

☆ ☆ ☆

ثمامہ لیکس نے تو خیر سب کچھ ہی کھول دیا تھا۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ گھر اور گھر والوں کے خیالات سے اتنی انجان ہوں یا انہیں سمجھ ہی نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے، بس یہ ضرور تھا کہ انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ بات کہاں تک پہنچی ہے اور سوچیں کتنی تنگ ہو گئیں۔ دل کتنا سکڑ گئے ہیں۔ رشتے "ہم" کا پیراہن اتار کر "میں" کے چولے اوڑھے، کسی منہ بند غار میں جا کر سو گئے ہیں۔ صور اسرافیل سے ہی اٹھیں تو اٹھیں۔۔۔ ہاں۔۔۔

ٹوٹے بھروسے کی زنجیر کی تمام کڑیاں ان کے پاس تھیں۔ مگر انہیں باہم جوڑ کر اب کیا ہوتا۔ بعض صورتیں بگڑ جائیں تو پھر کبھی درست نہیں ہوتیں۔

ان کی تو اولاد کی شکلیں بگڑی تھیں۔ یہ ہی کم ماتم تھا۔

"اور میں اسے ایک روایتی مشترکہ خاندانی نظام کے درمیان پیدا ہونے والی عام سی صورت حال سمجھ کر نظر انداز کرتی رہی۔"

انہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت سب یاد آنے لگا۔

بیوگی کے بعد اشعر نے سب چیزیں سنبھال لیں۔ انہیں احساس ہی نہ ہوا کہ کوئی مالی تنگی ہے۔ شوہر صاحب کی پنشن اور ان کے چھوٹے موٹے سائڈ بزنس جنہیں ثمامہ، ابا کی آف شور کمپنی کا نام دے کر ہنس رہا تھا۔

سارے گھر کو چلا رہے تھے۔ اشعر نے اور اچھی طرح سے چلایا۔ بہوئیں انہیں اچھی ملی تھیں۔ ایک پرسکون زندگی۔۔۔ اور تینوں بیٹوں کی شادیوں کے بعد مخصوص رقم طے کر دی گئی جو سب کو فرحت آرا کو دینی تھی، تاکہ انتظام بخوبی چلتا رہے۔

ثمر بڑا تھا، مگر شادی پہلے اشعر نے کی تھی۔ اسے پھپھی زاد پسند تھی اور پھپھی کو بیٹی کے رشتے کی جلدی تھی۔ اشعر کے چار بچے تھے۔ پھر ثمر کے پانچ۔ ایک تو بالکل چھوٹا تھا۔ دو برس کا۔۔۔ دوسری طرف اظہر کے ہاں شادی کے بارہ برس بعد بھی اولاد نہیں ہوئی۔ چلو جو حکم ربی۔۔۔ دونوں کو اولاد نہ ہونے کا قلق تھا۔ دن بھر میں کئی جملے اس محرومی کے حوالے سے شعوری یا لاشعوری طور پر نکل ہی جاتے۔

ایسے ہی ایک روز دونوں میاں بیوی نے ایک نیا جملہ کہا۔ کیونکہ وہ بے اولاد ہیں۔ یعنی صرف دو افراد اس لیے وہ اتنا خرچا نہیں دے سکتے جتنا کہ بچوں والے دے رہے ہیں۔ دونوں کے برابر بچے ہیں۔ بات صحیح تھی۔ فرحت آرا نے فوراً" مان لیا، ٹھیک ہے تم کم دو۔"

"نہیں امی! آپ ہمارا کچن الگ کر دیں۔" اظہر نے وہی کہا جو طے کر کے آیا تھا۔

"کچن۔۔۔ الگ۔۔۔ وہ کیسے میرا مطلب ہے۔۔۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ۔" اظہر نے ان ہی کے لفظ پکڑے۔ "میں چھت پر اپنے لیے پورشن بنوانا چاہ رہا ہوں۔ ہمیں پرائیویسی اور سکون چاہیے۔"

"پرائیویسی اور سکون۔۔۔" وہ بڑبڑا اٹھیں۔ "میں نے تو آج تک سوتی بہوؤں کے بند دروازے نہیں بجائے اور کون سی پرائیویسی اظہر۔۔۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل ادھر بچوں کا شور ڈسٹرب کرتا ہے میرا مطلب۔۔۔" وہ سب کے حیرت زدہ اور پھر بگڑتے چہرے دیکھ کر گڑبڑایا۔

"تمہارے بچے تمہیں ڈسٹرب کرتے ہیں؟" ثمر کی بیوی اور منجھلی ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم آواز ہو کر بولیں۔ اظہر فوراً" سنبھلا۔

"آپ غلط نہ سمجھیں بھابھی۔۔۔ ہمیں اپنی محرومی کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ بچوں کے لاڈ' ان کی ہنسی' ان کا رونا۔۔۔ ہمیں اپنے کمرے کے خالی پن کا زیادہ احساس کرواتا ہے۔ یہ تو بعض اوقات رو پڑتی ہے۔"

"جی امی! بڑی اذیت ہوتی ہے۔ جب صبح صبح بچے اسکول جانے میں ضدیں کرتے ہیں اور میں بستر پر چت لیٹی سوچتی ہوں کہ کیا کروں۔ میرا بھی کوئی بچہ ہوتا تو۔۔۔"

اظہر کی بیوی کی آواز رندھ گئی۔ فرحت آرا کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ جملے زیادہ دل گیر تھے یا انداز' ہائے کیسی محرومی۔۔۔

"میں نے سوچا۔۔۔ میں یہ سب نہ سنوں گی نہ دیکھوں گی تو ذرا سکون رہے گا۔ باقی جو آپ کہیں۔" وہ ان کے سینے سے لگی کہہ رہی تھی۔

سب کو حرف حرف سے سچائی کی مہک آنے لگی۔ ہائے جانے انجانے میں کیسے اس کی دل گرفتی کا باعث بن گئے سب۔۔۔ فیصلہ ہو گیا۔

اب مسئلہ فوری رقم کا تھا۔ فرحت آرا نے اپنے جمع جتھے سے اور اشعر سے رقم منگوا کر اوپر بنے دو کمروں کو سیٹ کروایا۔ کچن' واش روم وغیرہ۔۔۔ اور تب کے اوپر چڑھے میاں بیوی جب اترتے' جب ناگزیر ہو جاتا۔

اور اسی اظہر نے پورشن بنواتے وقت جس خالی جیب کا ذکر کیا تھا۔ وہ جیب فلیٹ بک کروانے میں خالی ہوئی ہو گی۔

"میں فیصلہ نہیں کر سکا امی!" ثمامہ نے کہا تھا۔ "اظہر بھائی پر رحم کھاؤں یا غصہ کروں۔" تب وہ خاموش رہی تھیں۔

"آئے دن کبھی کسی کی سالگرہ' کبھی کسی کا عقیقہ۔۔۔ کبھی پیدائش۔۔۔ امتحان میں پاس ہو جائیں تب بھی جیب ہلکی کرو۔۔۔ عید' شب برات پر تو شامت ہی آجاتی ہے۔"

فرحت آرا نے یہ جملے اپنے گناہ گار کانوں سے خود سنے تھے۔ جب ثمر کے گھر سب سے چھوٹا بچہ بہت سالوں بعد پیدا ہوا۔ سب بڑوں کے بیچ چھوٹی سی آواز دل خوش کر گئی۔ وہ تو یہ چاہ رہی تھیں کہ ثمر سے بات کر کے اسے اظہر کی گود میں دے دیں۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتیں' ثمامہ اور ثمین ایکا کر کے آگئے۔

"اظہر بھائی اور بھابھی اور طرح کے مزاج کے ہیں۔ انہیں اولاد کی کمی کا احساس تو ہے' مگر اس کمی نے ان کے دل کو گداز کرنے کے بجائے سخت کر دیا ہے۔ آپ یہ بات منہ سے بھی مت نکالنا۔"

اور وہ حیران رہ گئی تھیں' مگر جب بغور سوچا تو بالکل درست لگا۔ ہاں ان دونوں کے انداز میں بچوں کے لیے پیار اور والہانہ پن نہیں تھا۔ عجب سرد مہری اور جبری مسکان۔۔۔

"تم صحیح کہہ رہی ہو۔" اظہر حسب عادت بیوی کا ہم خیال ثابت ہوا۔

"ثمر بھائی تو بڑھ چڑھ کر دیں گے تحفے' اشعر کے بچوں کو۔۔۔ دوسرے ہی دن واپس جو مل جاتے ہیں' وہ بھی باہر ملک کے تحائف۔۔۔ ہمیں کون سا کوئی کچھ دیتا ہے۔۔۔ ایک پرفیوم یا گھڑی۔۔۔ شادی کی سالگرہ پر تحفہ دیا تو دیا۔۔۔ اسی لیے میں شادی کی سالگرہ مناتی ہوں۔۔۔۔ اور آپ کی بھی" وہ ہنس ہنس کر اپنی عقل مندی بتا رہی تھی اور اظہر سراہ رہا تھا۔ فرحت آرا کے دل میں یہ باتیں اتر گئیں اور اظہر کی بیوی دل سے اتر گئی۔ ایسا حساب کتاب۔۔۔

چالاکیاں۔۔۔ بدگمانیاں' نتیجہ نفرتیں۔۔۔ کس کس کے عیب گنتیں۔

کس کی صفائیاں سنتیں' کس کو دیتیں صفائیاں۔۔۔ شاہانہ نے تو براہ راست ماں کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ

ماں سے بیٹیوں کے رشتوں کے لیے دعا کا کہتی۔ پھر یہ بھی کہتی "کوئی اچھا رشتہ ہو تو بتائیں۔" لیکن بعد میں فرحت آرا نے سنا وہ ہر ایک سے کہہ چکی تھی۔

"امی کو کوئی اچھا رشتہ ملے گا تو وہ بیٹی کا کریں گی یا نواسی یاد رہے گی۔" فرحت آرا کے منہ پر کہتی تو وہ صاف جواب دیتیں کہ وہ ثمین کا یعنی بیٹی کا کریں گی۔ ان کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ پھر بھائیوں پر پڑ جاتی بچی۔۔۔ اللہ شاہانہ اور لبیق کو زندگی دے، وہ بیٹیوں کے سر پر سلامت تھے۔ مگر اس تلخ حقیقت کے باوجود یہ مقصد تو نہیں کہ وہ چاہتی ہیں کہ نواسیوں کے اچھے رشتے نہ ہوں۔ کاش شاہانہ ان کے منہ پر کہہ دیتی۔

لیکن اب۔۔۔ اب جبکہ سب کی حقیقتیں کھل کر سامنے آگئی تھیں۔ تو وہ ضرور ہی یہ بات شاہانہ سے کہہ دیں گی۔

لیکن کہیں گی تو کیا کیا۔۔۔ اور کس کس سے۔۔۔ اظہر کے خیال و اعمال کو وہ حالات کا مارا کہہ کر معاف کرنے کو تیار تھیں۔ مگر اشعر۔۔۔ اشعر ان کا سب سے پیارا بیٹا، سب سے اچھا بیٹا۔۔۔ اس نے کب سے ان سے جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔ وہ ان سے اپنی آمدنی چھپانے لگا جو راتوں کو فکر مندی سے ٹہلتیں کہ بچہ پردیس کاٹ رہا ہے۔

وہ یہ کہہ دیتا کہ اب ثمر اور اظہر پر ذمہ داری ڈالیں۔ اس نے جھوٹ کیوں کہا؟

اور اسی کیوں؟ کا سارا رونا تھا۔

"آپ نے کوئی ٹھیکا لیا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے، پوری ذمہ داری اٹھانے کی۔۔۔ امی سے کہیں، جہیز تقسیم کر دیں۔ چار بھائی ہیں خیر سے۔۔۔ اکیلے آپ تو نہیں۔۔۔ ثمامہ تو خود امی کا بچہ بن کر رہتا ہے، اس پر تو ڈالنی ہی نہیں ہے، ذمہ داری تو چلو اسے فیڈر بھیج دیں، مگر ثمر اور اظہر۔۔۔ اظہر کی تنخواہ جاتی کدھر ہے؟ کوئی بچہ بھی نہیں ہے۔۔۔ طے ہو جائے ثمین کی شادی۔۔۔ یا تو آپ فرنیچر دیں گے یا کھانا۔ زیور تو امی کے اپنے پاس سے ہو جائے گا۔

اور وہ ثمر۔۔۔ تنخواہ کے رونے میں ایک سے ایک

کپڑا پہنتی ہیں بھابھی۔۔۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا۔ پیسے پاس ہیں نہیں اور جوڑے پہ جوڑا۔۔۔ ادھر شاہانہ باجی نے خود سے ہی طے کر رکھا ہے۔ بیٹیوں کی شادیوں پر نان چھک کے نام پر کیا کیا اینٹھنا ہے۔"

ثمامہ باجی کا طریقہ سب سے جدا۔۔۔ امی کو بیچ میں لانا ہی نہیں ہے۔ ڈائریکٹ ڈائلنگ ہوتی ہے ان کی آپ سے۔۔۔ اوہو زیادہ صفائیاں دینے کی ضرورت نہیں۔۔۔ مجھے سب علم ہے۔"

مجھلی اشعر سے فون پر لگی تھی۔ انہوں نے حرف بہ حرف اپنے کانوں سے سنا تھا۔ کچھ باتوں سے وہ متفق تھیں۔ ثمر والی بدگمانی پر وہ ٹوکنا چاہتی تھیں کہ اس کی بیوی کے گرمی، سردی، عید، شب برات کے کپڑے نانی، نانا دیتے ہیں۔ غریب عورت بھی بیاہی بیٹی کے لیے کچھ رقم پلو سے باندھ کر رکھتی ہے۔ وہ تو پھر اچھے کھاتے پیتے تھے۔ مگر یہ تو اب پتا لگا ناکہ وہ سب ثمر کی اپنی کمائی تھی، بس نام تھا کہ امی کے ہاں سے آئے ہیں۔

اور ثمر کی بیوی۔۔۔ جسے بولتے رہنے کا خبط تھا۔ ثمامہ نے بارہا ثمر سے پوچھا۔ "سچ سچ بتائیے، سوتے میں بھی بھابھی بول رہی ہوتی ہیں نا۔" وہ ہر بات بتایا کرتی تھی، کھایا پیا تک۔۔۔ سچ، جھوٹ، عقل مندی، بے وقوفی سب۔۔۔ فرحت آرا کو وہ بہت پرخلوص لگتی۔ صاف گو، صاف دل جو ہر بات کہہ دیتی ہے۔ تو وہ دراصل ان سب کو لایعنی باتوں میں لگا کر اصل بات چھپائے بیٹھی تھی۔

تو یہ بے اختیاری و سادگی ایک ملمع تھی جو اس نے خود پر چڑھا رکھا تھا۔ ورنہ حقیقت میں تو۔۔۔ اور ثمامہ نے بتایا کہ ثمر بھائی اس لیے لب سیے بیٹھے ہیں کہ ابھی تو آپ ابو کی پینشن اور اشعر بھائی کے پیسے جو وہ آپ کے خرچ کی مد میں بھیجتے ہیں۔ ان پیسوں سے گھر کا بجٹ خسارہ پورا کرتی رہتی ہیں کہ ثمر کہاں سے دے گا۔ وہ جیسے چل رہا ہے۔ ویسے ہی چلنے دینے کی تاک میں بیٹھے ہیں۔ پھر اگر آپ کو کاروبار کا پتا لگے گا تو لامحالہ آپ مجھے بھی ساتھ لگانے کو کہیں گی کہ باہر کے

لوگ ملازم رکھنے سے بہتر ہے کہ اپنے سگے بھائی کو رکھو' جبکہ ثمر بھائی کے خیالات یہ ہیں کہ وراثت میں تو بھائیوں کی شراکت داری سمجھ میں آتی ہے۔ ہضم ہو جاتی ہے' مگر کاروبار میں رشتے... رشتے کو بھی خراب کرتے ہیں اور کاروبار کو بھی... اور بھابھی کا ایک سنہرا قول یہ بھی ہے کہ... پتا لگ جائے 'ایک بار فلاں کے پاس پیسہ ہے۔ سب کو ضرورتیں یاد آنے لگتی ہیں۔"

اتنے قانع' ایثار پسند ماں باپ کی اولادیں اتنی حسابی کتابی' اتنی خود غرض...

ان کی تو سمجھ میں نہیں آتا تھا' وہ بہت سارے پیسوں کا کریں گی کیا۔ دونوں میاں بیوی اپنے اپنے حساب اور بساط کے مطابق محنت کرتے تھے اور بے نیازی سے گھر میں کھپا دیتے تھے۔

دونوں کی آف شور سرگرمیاں تھیں۔ مگر وقت آتا تو شو ہو جاتیں۔ شوہر اور ساس نے قطعیت سے کہا تھا انہیں ان کے پیسوں کی ضرورت نہیں۔

مگر ضرورت پڑنے پر وہ اپنا حصہ لے کر پہنچ جاتی تھیں۔

"یہ کہاں سے آئے؟" شوہر پوچھتے ضرور...

"میں نے کمیٹی ڈال رکھی تھی۔"

"تم نے بتایا نہیں۔"

"پہلے دن طے ہوا تھا' آپ پوچھیں گے نہیں... اور میں بتاؤں گی نہیں' پیسے کہاں سے آرہے ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں۔"

"دو دکانوں کی جگہ تم تو اب سات دکانوں کو مال سپلائی کر رہی ہو فرحت...!" شوہر صاحب کے لہجے میں مسرت آمیز استعجاب ہوتا۔

"ہاں نا... کب سے..." وہ سادگی سے مان لیتیں۔

"تم نے بتایا نہیں..."

"آپ نے بھی تو نہیں بتایا تھا۔ اپنے سائڈ بزنس کا۔" وہ بغور دیکھتیں۔

"بتایا نہیں تو چھپایا بھی نہیں۔ یوں ہی چھوٹے موٹے ہاتھ مارنے کی کوشش کرتا ہوں فرحت... جو بھی کرتا ہوں اس گھر ہی کے لیے تو کرتا ہوں۔ جو بھی کماؤں' بچاؤں... لاتا تو اسی گھر میں ہوں اور جہاں تک نہ بتانے یا بقول تمہارے چھپانے کی بات ہے تو... میں تو خود سے بھی چھپاتا ہوں۔ یہ سب میری چھوٹی چھوٹی سی کوششیں ہوتی ہیں جنہیں میں اپنے گھر والوں کی خوشیوں اور آرام کی خاطر کرتا ہوں۔ دنیا چلانے کے لیے اللہ ہی نے یہ طریقہ رائج کیا ہے۔ اللہ خود سے کبھی مدد کرنے نہیں آتا۔ وہ ایک انسان کے لیے دوسرا انسان مقرر کر دیتا ہے۔ اپنی اپنی باری آنے پر سب اپنا اپنا فرض ادا کر دیتے ہیں۔ میرے لیے میرا باپ مددگار تھا۔ میں اپنے باپ کا مددگار بنا اور کل کو میرے بچے بھی اسی نہج پر چلیں گے۔ کائنات کا نظام ایسے ہی چلتا ہے۔"

وہ ان کی ہر بات پر سر ہلا رہی تھیں۔ مگر آج... ابھی... پتا نہیں ثمر... اشعر اور اظہر ٹھیک تھے یا غلط... اور ثمامہ نے کہا۔ "لوگ آف شور اکاؤنٹ اس لیے بناتے ہیں کہ انہیں حساب نہ دینا پڑے۔"

ان کے بھی کتنے سارے آف شور کام تھے اور شوہر صاحب کے بھی... یوں جیسے وہ دونوں دور دراز سے پیدل چل کر چلو بھر پانی لاتے ہوں اور گھر کے تالاب کو بھرتا ہو۔

جہاں سے بھی کمایا... تھوڑا یا زیادہ... سب کے سامنے لا کر پوٹلی کھل ہی جاتی تھی۔

پتا نہیں ان آف شور کمپنیوں کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا۔ پانامہ لیکس نے حکومت کے بڑے بڑے ایوانوں... اور سیاست کے بڑے بڑے بتوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پر ان کی جان ناتواں پر جو قہر ثمامہ لیکس نے ڈھایا تھا۔ اس سے ان کے وجود کی عمارت ریزہ ریزہ ہوئی تھی۔

ایک کمیشن ان کے انصاف کے لیے بھی مقرر ہونا چاہیے تھا۔

کاش انہیں بھی بلائے کوئی بڑا نیوز چینل' کسی بڑے سے اینکر کے پروگرام میں وہ اپنا مقدمہ پیش کریں۔ جس میں ان کا دل ٹوٹا تھا۔ آنکھ بھری تھی۔

کچھ سوال ان کے... کچھ جواب لازمی۔
دھوکا... دھوکا ہوتا ہے۔ انفرادی یا اجتماعی جیسا بھی ہو۔

مگر نہیں۔ انفرادی میں یہ ہوتا ہے کہ فرحت آرا آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر تکیہ بھگوتی ہیں اور اجتماعی میں قوم ملک ملت سر پکڑ کر روتی ہے' نسلیں روتی ہیں۔

بچپن میں استاد نے بتایا تھا۔ ہر وہ کام جو چھپا کر کیا جائے' وہ غلطی ہوتی ہے۔ گناہ ہوتا ہے۔ یا پھر دھوکا ہوتا ہے۔ (چھپاتے تو وہ دونوں بھی تھے... مگر...)

جن کی نیت صاف ہو' ان کا ظاہر باطن عیاں ہوتا ہے اور چھپائے نہیں چھپتا۔

اور کرنے کو تو وہ یہ بھی کر سکتی تھیں کہ سب کو سامنے بٹھا کر بتاتیں' میں جان گئی ہوں تم لوگوں کی اصلیت... مگر اس وقت کیا ہوتا جب وہ مکر جاتے۔ اور چلو مکر جاتے تو خیر تھی۔ اگر وہ کہہ دیتے کہ آپ کو کیا...؟ ہم بتائیں یا چھپائیں' تب کیا وقعت رہ جاتی۔

ٹھیک ہے پھر... وہ دھوکا دے کر خوش تھے۔ تو وہ تو پھر ماں تھیں۔ مائیں جو اولاد کی خوشی میں خوش رہتی ہیں... وہ یہ دھوکا کھانے کو تیار تھیں۔

انہوں نے ثمامہ اور ثمین دونوں کو منہ بند رکھنے کی تاکید کی۔ اور وہ خود بھی ایک کمزور عورت نہیں رہی تھیں۔ اس بار بھی گویا ڈوب کر ابھری تھیں۔

ان کی بڑی اولادوں نے اپنی اولادوں ہی کے لیے تو سارے پلان بنائے تھے' تو وہ بھی اب صرف ثمامہ اور ثمین کو دیکھیں گی۔ وہ نہیں پورا کریں گی' اب بجٹ خسارہ... وہ ان دونوں کو اپنے عزائم بتا رہی تھیں۔

"میں کسی سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔" وہ ثمین کے سوال پر انہوں نے کہا تھا اور ثمامہ لیکس کا انجام... ماستا کے ہاتھوں فقط در گزر رہا

اور بات کریں اگر پاناما لیکس کی تو...

یہ دور فاروقیؓ نہیں جب مال غنیمت میں آنے والے کپڑے میں سے غلط تقسیم کے شبے میں ایک عام آدمی خلیفہ وقت پر انگلی اٹھا کر سوال کر سکے۔ جواب مانگے اور خلیفہ اسے مطمئن کر دے۔

اسی لیے بعض جوابات کے لیے روز محشر کا انتظار کرنا پڑے گا۔ جب زبان نہیں بولے گی' مگر جسم کا رواں رواں زبان بن جائے گا۔